حضرت عمر بن خطابؓ

از قلم: اسعد ایلولوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس عالمِ رنگ وبو میں انسانوں کے بے شمار قافلے آتے جاتے رہیں، لوگ آتے گئے اور وقتِ محدود گذار کر چلے گئے، اور گئے تو ایسے کہ:

ع داستان تک باقی نہ رہی داستانوں میں

زمانہ انہیں بھول گیا؛ لیکن کچھ نیک فطرت اور پاک طینت بندے خاک کے پردہ سے ایسے اٹھے کہ زمانہ انہیں فراموش نہ کر سکا، ان کی ہر ہر ادا تاریخ نے اپنے سینہ میں محفوظ کی؛ تاکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو، ان ہی ربّانی شخصیات میں ایک دنیا کا عظیم المرتبت انسان اور شمعِ نبوت کا پروانہ بھی ہے، جس کے سر پر صحابیت کا تاج اور ہاتھ میں نصف دنیا کا راج تھا، جو تھا تو خاکی؛ مگر اوصاف میں مشابہ بہ مَلَکِ عالی، شان وشوکت اور رعب ودبدبہ ایسا کہ آج بھی نام سن کر قلوب پر برق گرتی ہے، یہ وہی ہے جس کا لقب ''فاروق'' ہے، لوگ جسے امیر المؤمنین ثانی کہتے ہیں، ہاں وہی جس کا نام ''عمر بن الخطاب'' ہے۔

نام ونسب اور ولادت: آپ کا نامِ نامی اسمِ گرامی ''عمر'' تھا، والد کا نام ''خطاب'' اور والدہ کا نام ''خنتمہ'' تھا، آپ کا نسب یہ ہے: عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزی بن رباح بن عبد اللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب۔

(فتح الباری:۷/۴۹)

آپ کا شجرۂ نسب ''کعب'' پر جا کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نسب نامے

سے مل جاتا ہے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ عدی بن کعب کا شمار قریش کے ان دس افراد میں ہوتا ہے جو بزورِ صلاحیت ولیاقت سارے عرب پر فائق اور اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ (الفاروق ۱/ ۲۲)

امام نووی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ آپ عام الفیل کے تیرہ سال بعد ۵۸۴ء میں پیدا ہوئے، آپ کی جائے پیدائش سرزمینِ مکہ ہے۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۸٦)

ایامِ جاہلیت میں

آپ عہدِ طفولیت میں عرب کے عام دستور اور قومی شعار کے مطابق جانور چرانے پر مامور ہوئے، آپ مقام ضجنان میں جانور مکہ سے قریب چرایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے والد بڑے سخت مزاج تھے، جنگل آنے جانے کے اوقات کی پابندی کرواتے تھے اور بصورتِ دیگر پیٹا بھی کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ عمر تو کیا کرے گا تجھے تو اونٹ چرانا بھی نہیں آتا؛ لیکن خطاب کو کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی عمر اونٹوں کی گلہ بانی کے بجائے دنیا جہاں پر حکمرانی کرے گا۔ (الفاروق: ۱/ ۲٦)

عبدالرحمٰن بن حاطب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی معیت میں مکہ سے روانہ ہوئے، جب مقامِ ضجنان سے گذر ہوا تو آپ رضی اللہ عنہ ٹھہر گئے اور کہنے لگے کہ: میں نے ایسا زمانہ بھی دیکھا ہے کہ میں اس جگہ خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا، آج میری حالت یہ ہے کہ لوگ دور دور تک میرے زیرِ

نگیں مقامات میں گھومتے پھرتے ہیں اور مجھ پر کوئی حاکم نہیں۔ پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

لاشيء فيما ترى إلا بشاشة		يبقى الإله ويودي المال والولد

(طبقات ابن سعد مترجم: ۳/۵۶)

تعلیم وتربیت

آپ رضی اللہ عنہ نے جب ہوش سنبھالا تو ساتھ ہی علوم وفنون کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا، چناں چہ آپ رضی اللہ عنہ ان علوم وفنون کے حصول میں سرگرم ہو گئے جو عرب کے رئیس زادوں کو سکھائے جاتے تھے اور عظمت وشرافت کا باعث خیال کیے جاتے تھے، وہ یہ ہیں: نسب دانی، سپہ گری، شہسواری، پہلوانی اور خطابت وسیاست۔

آپ رضی اللہ عنہ نسب دانی میں ماہر تھے، یہ فن آپ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ کا مخصوص امتیاز تھا، جاحظ کہتے ہیں کہ: آپ اور آپ کے والد اور دادا سب ''نسّاب'' تھے۔ (الفاروق: ۱/۲۷)

شہسواری میں اس قدر مہارت تھی کہ بھاگتے گھوڑے پر کود کر اس طرح سوار ہوتے کہ بدن میں مطلق حرکت نہ ہوتی تھی۔ (تاریخ ابن خلدون مترجم: ۱/۳۹۸)

آپ کی پہلوانی کے تذکرے زبانِ زدِ عام وخاص تھے، کہتے ہیں کہ: اوائلِ ذی القعدہ میں کوہِ عرفات کے قریب وسیع میدان میں عکاظ نامی میلہ لگا کرتا تھا، جہاں بیس دن تک گرم بازاری رہتی تھی، ہر جگہ سے ہر فن کے ماہر آتے اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے، آپ بھی ان معرکوں اور مسابقوں میں

شرکت کرتے تھے اور کئی معرکوں میں بازی لے جاتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کی پہلوانی کا چرچا سارے عرب میں ہوتا تھا۔ (سیرت عمر فاروق: ۵۳)

آپ کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی ہے کہ عرب کے عام امّیانہ ماحول میں آپ کا شمار ان قلیل التعداد افراد میں ہوتا تھا جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے: ''ظہورِ اسلام کے وقت تمام قبائلِ قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ان میں سے ایک عمر بن خطاب تھے''۔ (تاریخ ابن خلدون مترجم ۱/ ۳۹۸)

قوتِ بیان اور زورِ خطابت میں بھی بلند رتبہ پر فائز تھے، یہی سبب تھا کہ ایامِ جاہلیت میں منافرت ومفاخرت کے وقت آپ ہی ثالث اور سفیر ہوتے تھے۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۸۶)

فکرِ معاش

تعلیم وتربیت کے مرحلہ سے گذرے تو آپ کو معاش کا فکر دامن گیر ہوا، آپ نے عرب کے عام دستور کے موافق پیشۂ تجارت اختیار کیا، یہی تجارتی پیشہ آپ کی تعمیر وترقی میں بے حد مفید ثابت ہوا؛ کیوں کہ اس سے منسلک ہونے کی وجہ سے دور دراز ملکوں کے سفر کرنے کا موقع ملا اور دنیا کے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں جس کے طفیل آپ خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری اور معاملہ فہمی جیسے اعلیٰ اوصاف کی مجسم تصویر بن گئے۔ (الفاروق ۱/ ۲۹)

ظہورِ قدسی اور عمر

آپ عین شباب میں تھے کہ آفتابِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو بت پرستی چھوڑ کر توحید کی دعوت دی، پھر کیا تھا؟ دیکھتے ہی دیکھتے سارے عرب میں عداوت ومخالفت کی آگ لگ گئی، جو دوست تھے دشمن ہوگئے، جو اپنے تھے بے گانے ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروؤں پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹنے لگے، ہر شخص اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا، عمر بن خطاب نے بھی اسلام کے خلاف محاذ کھول دیا، ہر وقت اسلام دشمنی میں نورِ نبوت کو مٹانے کی منصوبہ بندی کرنے لگے، جس کسی پر قابو پاتے حد درجہ زد وکوب کرتے تھے، کہتے ہیں کہ لبینہ۔ جو آپ کے قبیلہ کی کنیز تھی۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی تو اس کو بے تحاشا مارنا شروع کردیا، مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے ''ذرا دم لے لوں، پھر ماروں گا''۔ (الفاروق:۱/۳۰)

ابن الخطاب نبی کے قتل کا بیڑا اٹھاتے ہیں

مسلمانوں کی روز افزوں ترقی قریشِ مکہ کے لیے ایک لمحۂ فکریہ تھی، وہ ہر لحظہ چراغِ حق کو گُل کرنے کی سوچتے تھے، ایک دفعہ مشاورت کے لیے جمع ہوئے، ابوجہل بولا کہ: کون ہے جو محمد کا کام تمام کرے، تو ابن الخطاب کھڑے ہوئے کہ میں محمد کے قتل کا بیڑا اٹھاتا ہوں عمر شمشیر بکف ہوکر دوپہر کو نکلے، اتفاق سے راستے میں حضرت نعیم بن عبد اللہ مل گئے۔ عمر کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر تو ہے، کہاں کا ارادہ

ہے؟ عمر بولے محمد کے قتل کا، جس نے مکہ میں انتشار پھیلا رکھا ہے۔ نعیم نے کہا کہ: بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے مطمئن ہو گئے ہو؟ کہنے لگے: لگتا ہے تو بھی بد دین ہو گیا ہے، لا! پہلے تجھے نمٹا تا ہوں، تلوار سونتی کہ حضرت نعیم کے منہ سے نکلا: پہلے اپنے گھر کا حال لو، اسلام تمہارے گھر میں داخل ہو چکا ہے، تمہارے بہنوئی سعید بن زید اور بہن فاطمہ بنت خطاب حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں، یہ سن کر غصّہ سے تلملائے اور رخ بدل کر اپنی بہن کے گھر پر پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، اس وقت گھر میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ قرآن پڑھا رہے تھے، کسی کی آہٹ محسوس کر کے وہ چھپ گئے، دروازہ کھلتے ہی بہن سے پوچھا، یہ دھیمی دھیمی آواز کیسی تھی؟ بہن نے کہا: کچھ نہیں، ہم بات کر رہے تھے، بولے: نہیں مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم بد دین ہو چکے ہو، اور اپنے بہنوئی سے دست و گریباں ہو گئے اور زدوکوب کرنے لگے، بہن مدافعت کے لیے آئی تو اس زور سے طمانچہ مارا کہ چہرہ خون آلود ہو گیا، خطاب کی بیٹی نے جب خون دیکھا تو خطابی رگ حرکت میں آئی، آگے بڑھ کر بڑی استقامت سے کہا: عمر! جو کرنا ہے کرلو، ہم ہرگز دامنِ اسلام نہیں چھوڑیں گے۔

مرادِ رسول: کتابِ جہل میں علم و ہنر کا باب کھلا

حد سے زیادہ زدوکوب کے بعد جب غصہ کم ہوا تو بہن کی حالتِ زار دیکھ کر شرمندگی ہوئی، اسی حالت میں صحیفۂ قرآنی پر نظر پڑی جو جلدی میں باہر رہ گیا تھا، کہا: لاؤ! ذرا میں بھی دیکھوں تم کیا پڑھتے تھے، بہن نے کہا: تو ناپاک ہے،

ہاتھ نہیں لگا سکتا، پہلے غسل کر۔ عمر اٹھے، غسل کیا اور صحیفہ لے کر سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات پڑھنے لگے، جوں جوں پڑھتے گئے توں توں پتھر دل موم ہوتا گیا اور دل کے نہاں خانے میں شمعِ اسلام روشن ہوتی گئی۔ آخر جب "إنني أنا اللّٰه لا إله إلا أنا فاعبدني واقم الصلوة لذكري" (طٰہٰ: ۱۴) پر پہنچے تو بول اٹھے: مجھے محمد کے درِ اقدس پر لے چلو۔ جب گھر کے کونے میں چھپے حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے سنا تو باہر نکل آئے اور گویا ہوئے اے عمر! تو مرادِ رسول ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبِ جمعہ میں دعا فرمائی تھی "اللهم أعز الإسلام بأبي جهل بن هشام أو بعمر بن الخطاب"۔ اے اللہ! اسلام کو ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب سے عزت عطا فرما۔ (ترمذی، باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ ۲/ ۲۰۹)

قافلہ بہاروں کا کس چمن میں ٹھہرا ہے؟

اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پروانوں سمیت دارِ ارقم میں تشریف فرما تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو سب گھبرائے کہ خدا جانے کیا معاملہ ہوگا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آنے دو، اگر نیک نیتی سے آیا ہے تو ٹھیک ہے؛ ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر اڑا دوں گا، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگے بڑھ کر عمر کا گریبان پکڑا اور فرمایا: کیوں عمر! اب بھی اگر اسلام نہیں لائے تو تمہارے متعلق وہی کچھ نازل ہوگا جو ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھا، مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ پڑی اور فرحت ومسرت سے بآوازِ بلند ایسا نعرۂ

تکبیر بلند کیا کہ اس کی صدائے بازگشت کعبہ میں سنی گئی۔(تاریخ الخلفاء للسیوطی:۸۸)

زمانہ آگیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یاد ہوگا

حضرت عمرؓ کے اسلام سے مسلمانوں کو غیر معمولی قوت وطاقت اور فتح حاصل ہوئی، ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کا اسلام؛ مسلمانوں کے لیے غیر معمولی فتح، آپ کی ہجرت؛ نصرت اور آپ کی امامت؛ رحمت تھی۔ہم بیت اللہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؛لیکن جب حضرت عمرؓ اسلام کی بیش بہا نعمت سے بہرہ ور ہوئے تو مسلمانوں کو کعبہ میں لے جاکر باجماعت نماز پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔
(تاریخ الخلفاء للسیوطی:۹۱)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، راز اب آشکارا ہوگا

سوئے یثرب ہجرت

حضرت عمرؓ کا اسلام کفار کے غیظ وغضب میں طغیانی کا باعث بنا، جس سے عدوّانہ جذبہ بھڑک اٹھا اور مسلمانوں کو بیخ وبن سے اکھیڑ کر ختم کرنے کی ناپاک سازشیں کرنے لگے؛ یہاں تک کہ سرزمینِ مکہ باوجود اپنی کشادگی کے مسلمانوں پر تنگ ہوگئی، تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کا حکم فرمایا کہ مدینہ چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ تمھیں وہاں امن وامان اور چین وسکون نصیب فرمائے گا۔اصحابِ وفا نے تعمیلِ ارشادِ نبوت میں گھر بار چھوڑے اور جانبِ مدینہ چل دیے، یہ بھی کفارِ مکہ کو

برداشت نہ ہوا، مزاحمتیں شروع ہوئیں، تعاقب کیا گیا، پکڑ کر واپس لایا گیا، مارا گیا؛ لیکن جاں نثاروں کے قافلے تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خفیہ مدینہ جانے کی ہر ممکن سعی کرتے رہے۔

حضرت عمرؓ نے جس شان کے ساتھ ہجرت فرمائی اس کا نقشہ حضرت علیؓ نے اس طرح کھینچا ہے: حضرت عمرؓ نے جب ہجرت کے ارادہ سے رختِ سفر باندھا تو شمشیر بکف ہوئے، کمان شانہ پر لٹکائی، ترکش میں تیر بھرے، پھر کعبہ میں تشریف لے گئے، بہ اطمینان طواف کیا، مقامِ ابراہیم پر دوگانہ پڑھے، پھر صنادیدِ قریش کے حلقوں کو للکار کر کہا: ہے کوئی؟ جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس پر روئے، اس کی بیوی سوگ منائے اور اس کی اولاد یتیم ہو، تو اس وادی سے نکل کر عمر بن خطاب سے ملے اور اس کی راہ روکے؛ لیکن کسی نے جرأت نہیں کی۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۹۱)

یہ ماجرا دیکھ کر غریب وکمزور مسلمان جو اکیلے ہجرت نہ کر سکتے تھے حضرت عمرؓ کے ساتھ ہو لیے اور ''فردِ واحد'' ''انجمن'' بن کر مدینہ پہنچا؛ اسی لیے عبد اللہ ابن مسعودؓ آپ کی ہجرت کو ''نصرت'' فرمایا کرتے تھے۔

نبوت کے شانہ بہ شانہ

کتبِ سیر کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عہدِ نبوی میں اشاعتِ دین کی غرض سے جس قدر غیر قوموں سے غزوات اور لڑائیاں ہوئیں اور

جتنے معاہدات اور صلحیں ہوئیں، اس میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شرکت سے خالی ہو۔ (الفاروق: ۱/ ۳۶)

ان تمام کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کچھ اہم کردار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

غزوۂ بدر

یہ اسلام اور کفر کے درمیان پہلا معرکہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس میں رائے وتدبیر اور جانبازی و پامردی کے لحاظ سے حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست و بازو بنے رہے، آپ رضی اللہ عنہ نے اس غزوہ میں اسلام کے علاوہ سارے رشتوں کا بےسود ہونا واضح کر دیا اور عاص بن ہشام بن مغیرہ۔ جو آپ رضی اللہ عنہ کا ماموں ہوتا ہے۔ کو اپنے خنجر سے واصلِ جہنم کیا۔ (خلفائے راشدین: ۱۰۶)

اس معرکے میں کفار کے ستّر آدمی اسیر ہوئے، ان کے بارے میں مسئلہ موضوعِ بحث بنا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے عزیز کو قتل کر کے دنیا کو پیغام دے کہ عزت و اکرام اسلام کی وجہ سے ہے نہ کہ قرابت داری سے؛ لیکن نبوت کی شانِ رحیمی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر رہا کر دیا؛ لیکن قسّامِ ازل کو کچھ اور ہی منظور تھا؛ اس لیے آیتِ کریمہ: وما كان لنبي أن يكون له

أسریٰ حتی یثخن في الأرض إلخ (الانفال: ٦٧) نازل کر کے عتاب فرمایا۔ (کشف الباری ۸/ ۸۰)

غزوۂ احد

۳ھ میں یہ معرکہ پیش آیا، ابتدا میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا؛ لیکن ادنیٰ لغزش کی وجہ سے جنگ کا پانسا پلٹا، حالات نے کروٹ لی اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا، ہر طرف خوف وہراس کا مہیب منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا، ایسے پُر ہیبت ماحول میں جن پروانوں نے تادمِ آخر شمعِ نبوت کی رفاقت نہ چھوڑی ان میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ (الفاروق: ۱/ ۴۶)

غزوۂ احد میں جب جوش وخروش کم ہوا اور کچھ اطمینان کی فضا ہموار ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تیس یاروں کو لے کر ایک پہاڑی پر تشریف لے گئے، چوں کہ دورانِ لڑائی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ اڑ چکی تھی، ابوسفیان دور سے چلایا: ''أفي القوم محمد''؟ کیا تم میں محمد ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارے سے فرمایا کہ: جواب مت دو، ابوسفیان کو جواب نہ ملا تو ابوبکر اور عمر کا نام لے کر پوچھا کہ یہ دونوں ہیں؟ لیکن اس کا بھی جواب نہ پایا، تو خود ہی فیصلہ کر کے بولا کہ یہ سب مارے گئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور غیرتِ ایمانی نے خموشی گوارا نہ کی اور بول اٹھے، اے دشمنِ خدا! اللہ تعالیٰ تیرے حزن وغم کو باقی رکھے، ہم سب زندہ ہیں، ابوسفیان بولا: ''اُعْلُ ھُبل'' ہبل کی جے ہو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے حسبِ ارشادِ نبوت ''اللّٰہ أعلیٰ وأجل'' کے نعرۂ پُرکیف سے فضا مہکا دی۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ احد: ۲ / ۸۹۳، حدیث: ۳۸۹۷، مطبوعہ ادارۂ دینیات)

غزوۂ خندق

۵ھ میں سارے عرب نے متحد ہو کر مدینہ کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے چڑھائی کی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق مدینہ سے باہر خندق کھدوائی، اس کے کناروں پر اکابرِ صحابہ کے مختلف محاذ متعین فرمائے؛ تاکہ کفار خندق پار نہ کر سکے، ان میں ایک محاذ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقرر تھے۔

(خلفائے راشدین: ۱۰۸)

صلح حدیبیہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیرتِ ایمانی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ اور صحابہ بیت اللہ کا طواف کر کے سر مونڈوا رہے ہیں، آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ارادۂ عمرہ کا اظہار فرمایا، چودہ سو یا پندرہ سو صحابہ پر مشتمل ایک بڑی جماعت آپ کی ہمرکاب ہوگئی۔ آپ مدینۂ منورہ سے روانہ ہوئے اور سفر کرتے کرتے مقامِ حدیبیہ پر پہنچے تو آپ کی قصواء نامی اونٹنی بیٹھ گئی، بہت کوشش کی؛ پر اٹھنے کا نام نہیں، آپ اشارۂ غیبی سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کچھ اور ہی ہے؛ اس لیے آپ نے وہیں ڈیرہ ڈال دیا اور کفارِ مکہ کو اپنے ارادہ سے باخبر کیا کہ ہم قتال کی غرض سے نہیں آئے؛ بلکہ مقصد بیت اللہ کی زیارت ہے۔ پھر کفار کی جانب سے یکے بعد دیگرے

لوگ آتے گئے؛ لیکن مسئلہ حل نہ ہوسکا، آخر میں سہیل بن عمرو آئے، ان کو آتا دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطورِ نیک فال کے فرمایا: "قد سهل لكم من أمر كم" کہ تمہارا معاملہ آسان ہوگیا، گفتگو کے بعد طے ہوا کہ مسلمان اور کفار کے درمیان صلح کا عہد ہوجائے۔ اس کے لیے کچھ دفعات مقرر ہوئیں، ان سب دفعات سے بظاہر مسلمانوں کی پسپائی نظر آرہی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل پر حیران وششدر تھے؛ لیکن کس کی ہمت تھی کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کہے؟ آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیرت ایمانی نے خموشی گوارا نہ کی، صبر نے دم توڑ دیا اور درِ اقدس میں آکر عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں؟ پھر عرض کیا: کیا ہم جادۂ حق پر اور ہمارے دشمن راہِ باطل پر نہیں؟ ارشاد ہوا کیوں نہیں؟ تو کہا پھر ہم دین کے معاملہ میں پسپائی ورسوائی کیوں اختیار کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکیمانہ جواب دیا کہ: بے شک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اور کوئی چیز اللہ کے امر کے بغیر نہیں کرتا، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلو۔

(بخاری ۱/ ۵۸۰ باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب، حدیث: ۲۶۵۱)

حقیقت تو یہ ہے کہ نبوت کی دوررس اور عاقبت اندیش نگاہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس صلح میں اگرچہ بظاہر مسلمانوں کی کمزوری اور پسپائی ہے؛ لیکن یہی مسلمانوں کی فتح ہے، چناں چہ دنیا نے مشاہدہ کیا کہ یہ مسلمانوں کے لیے کس طرح

فتح ثابت ہوئی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے بھی اس کو "فتحِ مبین" سے یاد کیا ہے۔

الغرض! ہمارا اس واقعے کو تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ حضرت عمرؓ ہی کی غیرت تھی جس نے صحابہ کی اجتماعی بے چینی کو ہمت وحوصلے کے ساتھ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گوش گزار کیا۔

فتحِ مکہ

۸ھ میں مکۂ مکرمہ مفتوح ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بابِ کعبہ پر کھڑے ہو کر تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، پھر حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر کوہِ صفا پر تشریف لے گئے، لوگ گروہ در گروہ درِ اقدس پر حاضر ہوئے اور بیعت کر کے داخلِ اسلام ہوئے، جب عورتوں کا مجمع آیا تو حضرت عمرؓ نے حسبِ ارشادِ نبوت ان سے بیعت لی، یہ آپؓ کا شرف تھا عہدِ رسالت ہی میں عورتوں نے آپ کے واسطے سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بیعت لی۔ (خلفائے راشدین:۱۱۱)

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک ۔جو بڑی عسرت وتنگی کا غزوہ تھا۔ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لوگوں کو مالی امداد کرنے کی ترغیب دی تو حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے تمام مال کا آدھا حصہ راہِ خدا میں نچھاور کر دیا۔ (ترمذی، مناقب ابی بکر الصدیق، ۲/۲۰۸)

کی عرض نصف مال ہے فرزند وزن کا حق	باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

وفات النبی اور حضرت عمرؓ کا جذبۂ عشق

۱/ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ کا دن دنیا کا تاریک ترین دن تھا، بڑے حزن والم کا دن تھا؛ کیوں کہ یہ اس ہستی کی رحلت کا دن تھا، جس کے لیے کون و مکان کو سجایا گیا تھا، خادمِ رسول حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جب نورِ نبوت مدینۂ منورہ میں طلوع ہوا تو ہر چیز روشن تھی اور جب غروب ہوا تو ہر چیز پر سیاہی اور تاریکی چھا گئی تھی۔ (الشمائل المحمدیۃ:۲۳۵)

حزن وملال کی وہ فضا قائم ہوئی کہ آج تک دنیا نے کبھی ایسی فضا نہ دیکھی تھی، حضرت عمرؓ جیسے جری وشجاع اور مستقل مزاج انسان کے پائے استقلال میں تزلزل آ گیا اور بے اختیار شمشیر بکف ہو گئے اور کہنے لگے: سر قلم کر دوں گا جس کسی نے کہا کہ محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی ہے۔ بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر صحابۂ کرامؓ کو سنبھالا۔ (الشمائل المحمدیۃ:۲۳۸)

استخلاف ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا عظیم الشان کارنامہ

اِدھر رسول خدا کی روحِ مبارک جسدِ عنصری سے پرواز ہوئی اور اُدھر صحابہؓ میں خلافت کا مسئلہ اٹھا، انصار نے سقیفۂ بنوساعدہ میں جمع ہو کر نعرہ بلند کیا ''امیر ہم میں سے ہوگا''۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے گوش گزار ہوئی تو بڑی فکر لاحق ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں وہاں تشریف لے گئے، آپؓ کی خواہش تھی کہ کلام میں پہل کرے؛ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے خموشی کا امر فرمایا اور خود آگے بڑھ کر

مناسب لب ولہجہ میں انصار کو سمجھایا کہ: ''امیر ہم میں سے ہوگا اور وزیر تم میں سے''۔ حضرت ابوبکرؓ کی بات سن کر آپؓ دل ہی دل میں گویا ہوئے جو باتیں میں سوچ کر آیا تھا وہی تمام باتیں حضرت صدیقِ اکبرؓ نے ارشاد فرمائی، غالب نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

الغرض! حضرت ابوبکرؓ نے سلسلۂ کلام کو طول دیتے ہوئے فرمایا: ''بايعوا عمر أو أبا عبيدة'' کہ اٹھو اور عمر یا ابوعبیدہ میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کرو۔ آپؓ نے کہا: نہیں، بیعت تو حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر ہوگی اور آگے بڑھ کر حضرت صدیقِ اکبرؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت ہوگئے اور لوگوں کو بھی بیعت کروایا، پھر جماعتِ انصار سے مخاطب ہوئے: تمہیں معلوم ہے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں صدیقِ اکبر کو امامت صغریٰ (نماز کی امامت) پر مامور کیا تھا جو صریح اشارہ تھا کہ امامتِ کبریٰ کے حقدار وہی ہیں۔

(سیرۃ عمر بن الخطاب للدکتور علی محمد الصلابی: ٦٩)

عہدِ صدیقی میں حضرت عمرؓ کی خدمات

مرتدین کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کی رائے

روئے زمین پر نیک لوگوں کا وجود فتنوں کے لیے سدِّ باب ہوتا ہے، آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ارتداد کی ہوائیں چلیں، کچھ لوگ مسیلمۂ کذاب کے ساتھ ہوگئے، ایک گروہ مانعینِ زکوٰۃ کا کھڑا ہوا، ان کے بارے میں حضرت ابو بکرؓ کی رائے ہی نہیں؛ بلکہ پختہ عزم وارادہ تھا کہ ان کے ساتھ قتال کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ اے خلیفۃ الرسول! آپ ان سے کس طرح قتال کریں گے جب کہ یہ لوگ کلمہ گو ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ”أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا لا إله إلا الله فمن قالها فقد عصم مني ماله ونفسه إلا بحقه وحسابه علی الله“، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ: نماز اور زکوٰۃ دونوں حقوق اللہ میں سے ہیں، جو دونوں میں تفریق کرے گا میں اس سے قتال کروں گا، بخدا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایک رسی بھی دیتا تھا وہ آج زکوٰۃ سے منع کرے گا تو میں اس سے قتال کروں گا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: بخدا اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے شرحِ صدر ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ حضرت ابوبکرؓ جادۂ حق پر ہے۔ (بخاری، مطبوعہ دینیات: ۱/ ۲۸۸، حدیث: ۱۳۸۳)

جمعِ قرآن اور حضرت عمرؓ کی فراستِ ایمانی

کاتبِ وحی زید بن ثابت انصاریؓ کا بیان ہے کہ جنگِ یمامہ کے بعد حضرت صدیقِ اکبرؓ نے مجھے طلب کیا اور کہا کہ: حضرت عمرؓ نے آکر مجھ سے درخواست کی کہ جنگِ یمامہ میں حفاظ بکثرت شہید ہوئے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس طرح حفاظ شہید ہوتے رہے اور قرآنِ کریم یکجا جمع نہ کیا گیا تو قرآن کا اچھا

خاصا حصہ ضائع ہو جائے گا اور آنے والی امت دستورِ خداوندی سے محروم رہ جائے گی؛ اس لیے قرآن کو جمع کر کے حکومت کی تحویل میں لے لیا جائے۔ پہلے پہل مجھ کو اس کام پر اقدام کی جرأت نہ ہوئی کہ میں ایسا کام کیوں کر کر سکتا ہوں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہیں کیا تھا؛ لیکن حضرت عمرؓ باصرار درخواست کرتے رہے؛ تا آں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے شرحِ صدر فرمایا۔

پھر حضرت صدیقِ اکبرؓ نے مجھ (حضرت زید بن ثابتؓ) سے عرض کیا کہ تم نوجوان، دانشمند اور کاتبِ وحی ہو، میں جمعِ قرآن کا کام تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ حضرت زیدؓ بھی ابتداءً آمادہ نہ ہوئے، یہ دونوں حضرات کہتے رہے؛ تا آں کہ اللہ تعالیٰ نے شرحِ صدر فرمادیا، پھر بڑے اہتمام اور محنت سے قرآن کو جمع کر دیا۔ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن: ۲/۱۱۵۶، حدیث: ۴۷۹۵) یہ جمعِ قرآن کا عظیم کارنامہ بھی حضرت عمرؓ کی مؤمنانہ فراست کا آئینہ دار تھا۔

استخلافِ عمرؓ

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب حضرت صدیق اکبرؓ کو اپنی رحلت کا یقین ہو گیا تو حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا، آپ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی میں ہی استخلاف کا مسئلہ طے کر جائے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ سے مشاورت کی، دونوں نے حامی بھری۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے آ کر دریافت کیا کہ آپ خلافت کس کے سپرد کرتے ہیں؟

تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ کرتا ہوں، دونوں نے عرض کیا: اے خلیفۃ الرسول! آپ اپنے رب کے حضور کیا جواب دیں گے؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم دونوں مجھے اللہ سے خوف دلاتے ہو؟ میں تم دونوں سے زیادہ عمر کو جانتا ہوں۔ واللہ! میں اپنے رب کے حضور کہوں گا کہ میں تیرے بندوں پر ایسے شخص کو خلیفہ مقرر کر کے آیا ہوں جو سب سے زیادہ بہتر تھا۔ رہ گئی بات ان کی سختی کی تو خلافت کا بارِ گراں آنے کے بعد وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

(طبقات ابن سعد: ۳/ ۶۲)

پھر مجمعِ عام میں لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے، تمہاری کیا رائے ہے؟ تو سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ (سیرۃ عمر بن الخطاب: ۸۵)

خلافت کے بعد پہلا خطبہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ؛ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تدفین سے فارغ ہوئے اور ہاتھ سے قبر کی مٹی جھاڑی اور اپنی جگہ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا:

"إن الله ابتلاكم بي وابتلاني بكم بعد صاحبي، فوالله لا يحضرني شيء من أمركم فيليه أحد دوني، ولا يتغيب عني فالو فيه عن أهل الجزء والأمانة، والله لئن أحسنوا الأحسنن إليهم ولئن أساؤوا الأنكلن بهم"۔

لوگو! میرے دو رفیقوں کے بعد اللہ تم کو میرے ذریعہ اور مجھ کو تمہارے

ذریعہ آزمانا چاہتا ہے، بخدا میرے پاس تمہارا جو بھی معاملہ پیش ہوگا میں خود ہی حل کروں گا، اور جو آدمی غائب رہا تو میں اس کفایت کرنے میں کوتاہی اور تقصیر نہیں کروں گا، بخدا لوگ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں گے تو میں ضرور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کروں گا، اور اگر بدسلوکی کریں گے تو میں ضرور انہیں سخت سزا دوں گا۔

(سیرۃ عمر بن الخطاب للدکتور علی محمد الصلابی: ۸۵)

عہدِ فاروقی ایک نظر میں

حکومت کی ترقی اور فتوحات کا دور عہدِ صدیقی سے شروع ہو چکا تھا، جب حضرت عمرؓ برسرِ اقتدار ہوئے اور زمامِ حکومت سنبھالی تو فتوحات کے سلسلہ کو مزید وسعت دی، مقالہ کا حجم ان فتوحات کی تفصیلات کا متحمل نہیں، اس لیے صرف نقشہ پیش کرنا ہی مناسب ہے:

نمبر شمار	سن	مفتوحہ علاقے اور اہم کارنامے
۱	۱۴ھ - ۶۳۵ء	دمشق، حمص، بعلبک، بصرہ، آبلّہ
۲	۱۵ھ - ۶۳۶ء	واقعۂ یرموک، جنگِ قادسیہ
۳	۱۶ھ - ۶۳۷ء	فتح بیت المقدس، اہواز، مدائن، جلولاء، تکریت، قنسرین، حلب، انطاکیہ، منبج، سروج، قرقیساء، جابیہ
۴	۱۷ھ - ۶۳۸ء	عام الرمادۃ، مسجدِ نبوی کی توسیع، ایلیاء، سرخ

۵	۱۸ھ - ۶۳۹ء	طاعون عمواس، حلوان، جندیسابور، فتح رہا، سمیساط، حران، نصیبین، موصل اوراس کے اطراف
۶	۱۹ھ - ۶۴۰ء	فتحِ قیساریہ
۷	۲۰ھ - ۶۴۱ء	مصر، تستر، خیبراور نجران سے یہود کی جلاوطنی
۸	۲۱ھ - ۶۴۲ء	نہاوند، اسکندریہ
۹	۲۲ھ - ۶۴۳ء	آذربائیجان، دینور، ماسبذان، ہمدان عسکر، قومس، طرابلس
۱۰	۲۳ھ - ۶۴۴ء	کرمان، سجستان، مکران، اصفہان اوراس کے نواحی

(ماخوذ از تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۰۴، ۱۰۵۔ تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام، عہد الخلفاء الراشدین: ۲۷۵)

حکومتِ فاروقی

خلافتِ اسلامیہ کا دور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عہد سے شروع ہو چکا تھا؛ لیکن باقاعدہ منظم نظامِ حکومت تشکیل نہیں دیا گیا تھا، جب فاروقِ اعظمؓ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو ایک طرف فتوحات کے جاری شدہ سلسلہ کو اس قدر وسیع کیا کہ قیصر وکسریٰ جیسی سپر پاور حکومتیں نیست ونابود ہو کر حکومتِ اسلامیہ میں ضم ہو گئیں تو دوسری طرف حکومت کا ایسا نہج اور نظام قائم کیا اور ایسے قوانین وآئین وضع کیے کہ آج تک دنیا ان ہی آئین کی روشنی میں ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

حکومتِ فاروقی شخصی تھی یا جمہوری؟

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حکومتِ فاروقی شخصی تھی یا جمہوری؟ اس اہم نقطہ کو حل کرنے کے لیے حکومتِ شخصیہ اور جمہوریہ کا تعارف نہایت ناگریز ہے۔ اس کے متعلق علامہ شبلی نعمانیؒ تحریر کرتے ہیں کہ:

''شخصی اور جمہوری نظامِ حکومت میں مابہ الامتیاز چیز عوام کی مداخلت ہے، جس قدر نظامِ حکومت میں عوام اور رعایا کا دخل ہوگا اس قدر جمہوری عنصر زیادہ ہوگا؛ اس لیے جمہوری سلطنت کی آخری حد یہ ہے کہ مسند نشینِ حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائے اور وہ جماعت کا رکنِ محض بن کر رہ جائے، برخلاف شخصی حکومت کے، اس میں تمام دار و مدار صرف ایک شخص پر ہوتا ہے''۔ (الفاروق: ۲ / ۱۳)

کچھ آگے چل کر مزید تحریر کرتے ہیں کہ: ''جمہوری حکومت کی اساسی بنیادیں تین ہیں: (۱) مجلسِ مشاورت، (۲) ہر شخص کو اپنے حقوق واغراض کی حفاظت کا پوری آزادی کے ساتھ اختیار، (۳) بادشاہِ وقت کا ہر قسم کے حقوق میں عام رعیت کے برابر ہونا''۔ (الفاروق ۲ / ۱۹) اس نقطۂ نظر سے اگر خلافتِ فاروقی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخصی ہو کر بھی جمہوری حکومت تھی، کیوں کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے نظامِ حکومت کو ان ہی ضابطوں پر قائم کیا تھا؛ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ نام نہاد جمہوری حکومتوں سے بڑھ کر مقاصدِ جمہوریت اپنی تئیں لیے ہوئے تھی۔

مجلسِ مشاورت

حضرت فاروقِ اعظم نے اپنے دورِ خلافت میں مجلسِ مشاورت کا انعقاد فرمایا، تمام پیش آمدہ مسائل اسی مجلس میں طے کیے جاتے تھے، طریقۂ کار یہ تھا کہ ایک آدمی "الصلاۃ الجامعة" کہہ کر ندا دیتا، سب لوگ جمع ہو جاتے، حضرت عمرؓ مسجدِ نبوی میں تشریف لے جاتے اور دوگانہ پڑھتے، پھر برسرِ منبر خطبہ دیتے اور بحث طلب امر لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور امور طے کیا کرتے۔ (الفاروق: ۲/ ۱۶)
اس مجلس میں انصار ومہاجرین کے خصوصی ارکان کا حاضر ہونا ضروری تھا، اور جن لوگوں کو بطورِ خاص مندوب کیا جاتا تھا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ۔ (سیرۃ عمر بن الخطاب: ۹۲)

اس مجلسِ مشاورت کا اجلاس خاص خاص موقع پر ہی ہوتا تھا؛ لیکن اس کے علاوہ ایک اور کمیٹی تھی جس کے ارکان خاص مہاجرین تھے، اس میں یومیہ امور اور ضروریاتِ زندگی پر گفتگو ہوتی تھی، یہ مجلس مسجدِ نبوی میں منعقد ہوتی تھی، جو رپورٹ صوبجات اور اضلاع کی دربار میں پہنچتی تھی اس کے متعلقہ امور کی تعیین وتشخیص اسی مجلس میں ہوتی تھی۔ (الفاروق ۲/ ۱۸)

آزادانہ اختیار

حضرت عمرؓ نے سب لوگوں کو اپنے حقوق واغراض کے متعلق پورا اختیار

دیا تھا، لوگ آزادانہ اور بے باکانہ اپنے حقوق کا اظہار کیا کرتے تھے، ہر سال ممالکِ اسلامیہ کے اطراف واکناف سے سفارتیں صرف اس مقصد سے آتی تھیں کہ خلیفۂ وقت کو رعایا کے احوال وضروریات سے باخبر کیا جائے، خود حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اس جمہوری عنصر کا اپنی تقریروں اور تحریروں میں اعلان کیا کرتے تھے، اور تمام حقوق میں اپنے آپ کو رعیت کا ایک فرد خیال کرتے تھے اور اپنے تصرفات کا دائرہ محدود رکھتے تھے، ایک مرتبہ تقریر میں تصریح کردی کہ حکومت کے لحاظ سے ان کی کیا حیثیت ہے؟

"إنما أنا ومالكم كولي اليتيم، إن استَغْنَيْتُ اِسْتَعْفَفْتُ، وإن افتقرتُ أكلتُ بالمعروف، لكم عليَّ أيها الناس! حضالٌ، فخذوني بها، لكم عليَّ أن لا اجتبى شيئا من خراجكم ومما افاء الله عليكم إلا من وجهه، لكم عليَّ إذا وقع في يدي أن لا يخرج مني إلا في حقه، ولكم عليَّ أن أزيدَ في أعطياتكم وأسُدَّ ثغوركم، ولكم عَليَّ أن لا أُلْقِيَكُمْ في المَهالك". ترجمہ: میرا تمہارے مال کے ساتھ تعلق ایسا ہی ہے جیسا یتیم کے ولی کا یتیم کے مال کے ساتھ ہوتا ہے کہ اگر مجھے مال کی حاجت نہ ہوگی تو میں تمہارے مال سے بچتا رہوں گا، اور اگر ضرورت محسوس ہوگی تو قاعدہ کے موافق لوں گا۔ اے لوگو! تمہارے مجھ پر چند حقوق ہیں جن کے بارے میں تم کو میری گرفت کا پورا حق ہے: ایک یہ کہ خراج اور مالِ غنیمت کو صحیح طریقہ پر وصول کروں، دوسرا یہ کہ میرے قبضہ میں آئے ہوئے

مال کو بیجا طور پر صرف نہ کروں، تیسرا یہ کہ تمہارے روزینے بڑھادوں، چوتھا یہ کہ تمہاری سرحدوں کو مضبوط کروں، پانچواں یہ کہ تمہیں خطروں میں نہ ڈالوں۔

(خلفائے راشدین: ۱۳۳)

صوبجات کی تقسیم

تمدن کی ترقی یافتہ صورت یہ ہے کہ ہر شعبہ، ہر محکمہ جدا جدا ہو، حکومت کے نظم ونسق کی کامیابی بھی یہی ہے کہ انتظامات کے تمام شعبے اور محکمے علاحدہ علاحدہ ہوں، تاریخِ اسلام میں حضرت عمرؓ وہ پہلے آدمی ہے جنہوں نے حکومت کو صوبہ، ضلع اور پرگنہ میں منقسم کیا، اس بارے میں آپؓ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ مفتوح علاقے اگر پہلے ہی سے منقسم ہوتے تو اس کو بحال رکھتے، نئ تقسیم نہ فرماتے؛ البتہ جہاں ضرورت متقاضی ہوتی تو قدرے تصرف کر لیا کرتے۔ فلسطین دس اضلاع پر مشتمل ایک ہی صوبہ تھا، جب حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ھ میں بنفسِ نفیس فلسطین جا کر معاہدۂ امن لکھا، تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک کا صدر مقام ایلیا اور دوسرے کا صدر مقام رملہ مقرر کیا، علقمہ بن حکیم اور علقمہ بن مُحرز کو ایک ایک حصے پر عامل متعین کیا۔ (الفاروق: ۲ / ۲۳)

غرض یہ کہ تمام ممالکِ مفتوحہ کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کیا۔ مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر اور فلسطین۔ اس کے سوا تین اور صوبے تھے: خراسان، فارس اور آذربائیجان۔ ہر صوبہ میں مندرجۂ ذیل عہدے دار مقرر کیے۔

والی، کاتب، کاتبِ دیوان (فوجی محکمہ کا منشی)، صاحب الخراج (کلکٹر)، صاحبِ احداث (پولیس)، صاحبِ بیت المال اور قاضی۔

(تاریخ ابن خلدون ۱/ ۳۸۵)

عمال کی تقرری کا نرالا طریقہ: عمال کی تقرری عام طور پر مجلسِ شوریٰ میں ہوتی تھی، اس کا طریقہ یہ تھا کہ آپؓ کسی لائق، راست باز اور متدین شخص کا نام پیش کرتے تھے۔ اربابِ مجلس اپنی رائے پیش کرتے تھے اور اس طرح عمال کی تقرری ہوتی تھی۔ (تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۳۸۶) جب کسی کی تقرری ہوتی تھی تو ایک تحریر نامہ دیا جاتا تھا جس میں اس کے فرائضِ منصبی اور اختیارات کا بیان ہوتا اور مہاجرین وانصار کی گواہی ثبت ہوتی تھی، اور وہ اس بات کا پابند تھا کہ اپنے مقام پر جا کر مجمعِ عام میں تحریر پڑھ کر سنائے؛ تاکہ عوام گورنر کے تصرفات سے واقف ہو سکے اور بصورتِ دیگر گرفت کر سکے۔ (الفاروق: ۲/ ۳۰)

پیامِ فاروقی عمّال کے نام

فاروقِ اعظمؓ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ لوگوں کے حقوق کی پاسداری کی جائے، اور اس بابت ہمیشہ عمّال کو تاکیدی حکم دیتے تھے، ایک مرتبہ لکھا:

”ألا وإني لم أبعثكم امراء ولا جبارين، ولٰكن بعثتم أيمة الهدى يهتدي بكم، فأَرَدُّوا على المسلمين حقوقهم، ولا تضربوهم فتذلوهم ولا تحمدوهم فتفتنوهم، ولا تغلقوا الأبواب دونهم، فيأكل قويهم ضعيفهم،

ولا تستأثروا علیهم فتظلموهم"۔ ترجمہ: میں نے تم کو امیر اور ظالم بنا کر نہیں بھیجا؛ بلکہ تم کو راہِ راست پر لانے والا بنا کر بھیجا ہے؛ تاکہ لوگ تمہارے ذریعہ راہِ حق پر آئے، تم مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری کرنا اور ان کو مت مارنا؛ کیوں کہ اس سے ان کی ذلتی ہوگی، اور ان کی بے جا تعریف مت کرنا کہ وہ فتنہ میں پڑ جائے، اور ان کی ضرورت کو پوری کرنا اور دروازے بند نہ کرنا کہ طاقتور کمزور کو کھا جائے، اور تم اپنے آپ کو ان پر ترجیح مت دینا۔ (تاریخ ابن خلدون ۱/۳۸۶)

ہر عامل سے تاکید کے ساتھ عہد کیا جاتا تھا کہ ترکی گھوڑے پر سواری نہ کریں، باریک کپڑا زیب تن نہ کریں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازہ پر دربان نہ رکھیں اور ہمیشہ اہلِ حاجت کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں۔

(تاریخ الاسلام ووفیات المشاهیر والاعلام، عهد الخلفاء الراشدین:۲۶۶)

حکومتِ فاروقی کا مالی انتظام

عہدِ فاروقی میں مالی نظام اس قدر استوار ہوا کہ اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا، ذرائعِ آمدنی یہ تھے: خراج، عشور، زکوۃ، عشر، جزیہ اور مالِ غنیمت کا خمس، ان میں سے اہم ذرائع کو کسی قدر تفصیل سے ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

خراج: یہ ارضی ٹیکس ہے، عرب کی تمدنی تاریخ اس کے نظم ونسق سے عاری تھی، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہے جنہوں نے اس نظام کو مستحکم کیا اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۶ھ میں عراق، حکومتِ اسلامیہ کے زیرِ دست آ گیا اور جنگِ

یرموک کی وجہ سے رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یک گونہ فراغت حاصل ہوئی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے خراج کا نظام مستحکم کرنے کے لیے عراق کی مردم شماری اور زمین کی پیمائش کروائی اور اس کام کے لیے سعد بن ابی وقاص، عثمان بن حنیف اور حذیفہ بن یمان کو مامور کیا، انہوں نے بڑی محنت کے بعد رپورٹ تیار کی کہ عراق کی مزروعہ زمین تین کروڑ ساٹھ لاکھ (۳،۶۰،۰۰،۰۰۰) جریب ہے۔

[جریب: حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ فرماتے ہیں: جریب ساٹھ مربع گز کو کہا جاتا ہے، جو ہمارے ملک کے مروجہ ''بیگہ'' کے قریب ہے۔ (الاوزان المحمودہ: ۸۲)] فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان تمام زمینوں کو مالکان کے قبضے میں بہ دستور باقی رکھا اور حسبِ ذیل خراج مقرر کیا۔

نمبر شمار	پیداوار کے اسما	پیداوار کی مقدار	خراج کی مقدار
۱	جَو	فی جریب (۱)	ایک یا دو درہم سالانہ
۲	نیشکر (گنّا)	فی جریب (۱)	چھ درہم سالانہ
۳	روئی	فی جریب (۱)	پانچ درہم سالانہ
۴	انگور	فی جریب (۱)	دس درہم سالانہ
۵	نخلستان	فی جریب (۱)	دس درہم سالانہ
۶	تِل	فی جریب (۱)	آٹھ درہم سالانہ
۷	ترکاری	فی جریب (۱)	تین درہم سالانہ

۸	گیہوں	فی جریب (۱)	چار درہم سالانہ
۹	افتادہ قابلِ زراعت زمین	فی جریبین (۲)	ایک درہم سالانہ

اس طرح عراق کے سالانہ خراج کا مجموعہ آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ (۸،۶۰،۰۰،۰۰۰) درہم ہوتا تھا، دوسرے سال حضرت فاروقِ اعظمؓ نے خراج کی شرح میں کمی کر دی جس کی وجہ سے افتادہ زمینیں مزید آباد کی گئیں اور خراج کی مقدار آٹھ کروڑ سے بڑھ کر دس کروڑ بیس ہزار (۱۰،۰۰،۲۰،۰۰۰) درہم تک پہنچ گئی۔ (تاریخ ابن خلدون مترجم: ۱/ ۳۸۹۔۳۹۰)

خراج کی وصولیابی میں فاروق اعظمؓ کا احتیاط

حضرت فاروقِ اعظمؓ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب عراق سے اس قدر خطیر رقم بطورِ خراج آتی تو دس دس افراد کو جو قابلِ اعتماد اور ثقہ ہو، کوفہ اور بصرہ سے طلب کرتے اور چار مرتبہ شرعی قسم دے کر پوچھتے کہ کہیں خراج کی وصولیابی میں کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم تو نہیں ہوا؟ (الفاروق: ۲/ ۴۵)

عشر: عشر ایک نوع کی عبادت ہے اور زمین کی زکوٰۃ ہے، یہ عشری زمین پر لازم ہوتا ہے۔ عشری زمین تین طرح کی ہوتی ہے:

(۱) عرب کی وہ مقبوضہ زمین جس کے مالک اوائلِ اسلام میں مسلمان ہو گئے ہو۔

(۲) وہ مقبوضہ زمین جو ذمی کے قبضہ سے نکل کر مسلمان کے قبضہ میں آ گئی

ہو،مثلاً وہ لاوارث مرگیا۔

(۳)وہ غیر مملوک افتادہ زمین جس کوکسی مسلمان نے آباد کیا ہو۔

ان تمام زمینوں پر شرعی اعتبار سے عشر واجب ہوتا ہے، بخاری کی روایت ہے ”فیما سَقَتِ السماءُ والعیونُ أو کان عَثَرِیًّا العشر“جن زمینوں کو بارش کے پانی یا چشموں کے ذریعہ سیراب کیا جائے یا جو نہر کے کنارے ہوتو اس میں عشر لازم ہوگا۔ (بخاری، کتاب الزکوۃ:۱/۳۰۸)

یہی دستور عہدِ فاروقی میں قائم رہا؛ البتہ ایران کی وہ مقبوضہ زمین جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھی ان کی آبیاری ذمیوں کی قدیم نہریں کرتیں تو خراج لازم ہوتا اور اگر ان کی سینچائی مسلمانوں کے کنوؤں یا نہروں سے ہوتی توعشر لازم کیا جاتا تھا۔ (الفاروق:۲/۵۷)

عشور: اس کو ’’چنگی‘‘ کہتے ہیں جو شہر کے باہر سے آنے والے مال تجارت پر لازم ہوتا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی اولیات میں سے ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ جو مسلمان تجار بغرضِ تجارت دوسرے مما لک میں جاتے تھے، ان سے وہاں کے آئین کے مطابق مالِ تجارت پر فی صد دس روپیہ ٹیکس لیا جاتا تھا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے امیر المؤمنین کو اس سے باخبر کیا تو آپؓ نے حکم جاری کیا کہ ان ملکوں کے جو تاجر ہمارے ملک میں آئے تو ان سے بھی اسی قدر رقم وصول کی جائے، پھر رفتہ رفتہ تمام مفتوح علاقوں میں اس قانون کو نافذ کر دیا اور اس کے لیے

خاص محکمہ قائم کیا، اس طرح حکومتِ اسلامیہ کے لیے آمدنی کا بڑا ذریعہ ہو گیا۔
(الفاروق: ۲/ ۵۹)

حکومتِ فاروقی کے مختلف شعبے

یہ بات مسلّم ہے کہ حکومت کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر شعبہ کا جدا جدا ہونا ناگزیر ہے، آغازِ اسلام میں بعض مصالح کی وجہ سے حکومت کے مختلف شعبے قائم نہیں ہوئے تھے؛ لیکن جب عہدِ فاروقی میں حکومت کا دائرہ وسیع ہوا تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ حکومت کے ہر شعبہ اور محکمہ کو ممتاز کر دیا جائے، چناں چہ آپ رضی اللہ عنہ نے ذیل میں مذکور شعبے قائم کیے: شعبۂ عدالت، شعبۂ افتا، شعبۂ فوجداری، شعبۂ بیت المال اور شعبۂ تعلیم۔

شعبۂ عدالت: تمدن کی ترقی کا پہلا دیباچہ یہ ہے کہ عدلیہ کو انتظامی شعبوں سے علاحدہ کر دیا جائے۔ دنیوی دیگر حکومتوں کا حال یہ تھا کہ مدتوں بعد شعبۂ انتظام اور شعبۂ عدلیہ الگ ہوئے، برخلاف حکومتِ فاروقی کے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمامِ حکومت سنبھالنے کے چند روز بعد ہی عدلیہ کو الگ قائم کر دیا۔ بڑے حزم واحتیاط اور نکتہ شناسی وباریک بینی سے قضاۃ کا انتخاب کیا۔ مدینۂ منورہ میں حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ، بصرہ میں حضرت کعب بن الاسود ازدی رضی اللہ عنہ، فلسطین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح؛ قاضی مقرر ہوئے، ان کے علاوہ جمیل بن معمر جمحی، ابو مریم حنفی، سلمان بن ربیعہ

باہلی، عبد الرحمٰن بن ربیعہ، ابوقرۃ کندی اور عمران بن حصین رحمہم اللہ کا بھی عہدِ فاروقی کے قضاۃ میں شمار ہوتا ہے۔ (الفاروق: ٢/ ٦٧)

قضاۃ کو جادۂ حق سے منحرف ہونے سے بچانے کے لیے اور حسنِ انتظام کے خاطر بیش بہا مشاہرے مقرر کیے گئے، چناں چہ سلمان بن ربیعہ اور قاضی شریح کا مشاہرہ پانچ سو درہم بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام فرمان بھیجا کہ: ''دولت مند اور معزز ہی کو عہدۂ قضا سپرد کیا جائے؛ کیوں کہ دولت مند رشوت کی طرف راغب نہ ہوگا اور معزز آدمی کسی کے خلاف فیصلہ کرنے میں رعب وداب سے متاثر نہ ہوگا۔ (الفاروق: ٢/ ٦٧)

شعبۂ افتا: یہ بات اصولِ فقہ میں مصرح ہے کہ ہر مسلمان کا بنیادی احکامِ دینیہ سے واقف کار ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ دارالاسلام میں مسائل سے عدمِ واقفیت کو عذر نہیں سمجھا جاتا، شعبۂ افتا سے عوام الناس کی یہی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ اس شعبہ کے قیام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز یگانہ تھا، آپ نے چیدہ چیدہ افراد کو نامزد کیا جو اس فن کے شہسوار تھے اور دوسرے لوگوں کو فتویٰ دینے سے منع کر دیا؛ تاکہ شعبۂ افتا بازیچۂ اطفال نہ بن جائے، چناں چہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو افتا کی خدمت پر مامور کیا، آپ رضی اللہ عنہ بار بار مجمعِ عام میں اعلان

کیا کرتے تھے کہ دین سیکھنے اور مسائل معلوم کرنے کے لیے ان حضرات کی طرف رجوع کیا کرو، ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"من أراد القراٰن فليأتِ أبيًّا، ومن أراد أن يسأل الفرائضَ فليأت زيداً، ومن أراد أن يسألَ عن الفقه فليأت مُعاذًا"۔ (الفاروق: ۲/ ۷۲) جو آدمی قران سیکھنا چاہے تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے سیکھے، جو علمِ فرائض کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہے تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس جائے اور جو علمِ فقہ اور مسائل دریافت کرنا چاہے تو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس جائے۔

شعبۂ احداث: نظامِ حکومت کو صحیح نہج پر قائم رکھنے اور لوگوں کو قوانین پر عمل پیرا کرنے کے لیے قوت وطاقت کا ہونا از حد ضروری ہے، اور اس کے لیے حکومت شعبۂ احداث (پولیس محکمہ) قائم کرتی ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی مستقل بنیاد ڈالی، اور اس خدمت کے لیے حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو مامور کیا، حضرت قدامہ رضی اللہ عنہ کو مال گزاری کی وصولیابی پر مقرر کیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو پولیس کے اختیارات عطا کیے اور ذیل کے امور ان کے سپرد کیے:

(۱) دوکان دار ناپ تول میں کمی نہ کرے (۲) کوئی سڑک پر گھر نہ بنائے (۳) جانور پر زیادہ بوجھ نہ لادے (۴) علانیہ شراب نہ بکنے پائے۔ قانون سے سرِ مو انحراف کرنے والوں کی سزا کے خاطر جیل خانہ بنوایا۔ سب سے پہلا

جیل خانہ صفوان بن امیہ کا گھر تھا جو مکۂ مکرمہ میں تھا، فاروقِ اعظمؓ نے چار ہزار درہم کے عوض خرید کر جیل خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ (الفاروق: ۲/ ۷۳)

بیت المال کا باقاعدہ انتظام

حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں بیت المال کا بالکل وجود ہی نہ تھا؛ بلکہ جو کچھ مال دربارِ رسالت میں آتا فوراً تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ عہدِ صدیقی میں بھی تقریباً یہی صورتِ حال رہی؛ لیکن جب حضرت فاروقِ اعظمؓ برسرِ اقتدار ہوئے اور ۱۵ھ میں حضرت ابوہریرہؓ جو بحرین کے گورنر تھے، پانچ لاکھ کی خطیر رقم لے کر آئے، تو آپؓ کو فکر لاحق ہوئی کہ اس قدر خطیر رقم کو کہاں صرف کیا جائے؟ تو مجلسِ مشاورت کا انعقاد کر کے لوگوں سے رائے دریافت کی، حضرت علیؓ نے کہا: ''ساری رقم لوگوں میں تقسیم کر دی جائے، محفوظ نہ کی جائے''۔ حضرت عثمانؓ نے رائے دی کہ حکومت کے خزانے میں محفوظ کر لی جائے۔ ولید بن ہشام نے کہا کہ: میں نے سلاطینِ شام کے ہاں خزانہ کا دفتر دیکھا ہے۔ آخر حضرت عمرؓ نے یہی رائے پسند کی اور بیت المال کی بنیاد ڈالی، اور دارالخلافت (مدینۂ منورہ) میں بڑا خزانہ قائم کیا اور اس کی حفاظت ونگرانی اور حساب وکتاب کے لیے عبداللہ بن ارقم کو مقرر کیا اور معاونین کے طور پر عبدالرحمٰن بن عبید قاری اور معیقب کو طے کیا، پھر رفتہ رفتہ دیگر صوبجات اور صدر مقام میں بھی بیت المال قائم کیے۔

(الفاروق: ۲/ ۷۵)

صیغۂ فوج: آغازِ اسلام میں فوج کا کوئی منظم نظام نہ تھا اور نہ ہی ضرورت اس کی متقاضی تھی؛ لیکن جب ۱۵ھ میں حضرت ابو ہریرہؓ جو بحرین کے گورنر تھے پانچ لاکھ کی خطیر رقم لے کر دربارِ فاروقی میں تشریف لائے، حضرت فاروقِ اعظمؓ نے مجلسِ مشاورت میں یہ امر طے کیا کہ فوج کے دفاتر اور رجسٹر تیار کیے جائے، چناں چہ آپ نے حضرت مخرمہ بن نوفلؓ، حضرت جبیر بن مطعمؓ اور حضرت عقیل بن ابی طالبؓ کو یہ خدمت حوالہ کی جو علم الانساب کے ماہر استاذ تھے، انہوں نے اول قریش اور انصار کے دفتر مرتب کیے اور ہر شخص کا نام مع ولدیت ونسب بالتفصیل درج کیا، پھر آپؓ نے حسبِ ذیل وظیفے مقرر کیے:

نمبر شمار	مراتب	سالانہ مقدارِ وظیفہ
۱	جو لوگ جنگِ بدر میں شریک ہوئے تھے	۵۰۰۰ درہم
۲	مہاجرینِ حبشہ، شرکائے غزوۂ احد	۴۰۰۰ درہم
۳	فتحِ مکہ سے پہلے ہجرت کرنے والے	۳۰۰۰ درہم
۴	فتحِ مکہ کے وقت ایمان لانے والے	۲۰۰۰ درہم
۵	جنگِ یرموک اور قادسیہ کے شرکا	۲۰۰۰ درہم
۶	اہلِ یمن	۴۰۰ درہم
۷	قادسیہ اور یرموک کے بعد کے مجاہدین	۳۰۰ درہم
۸	بلا امتیازِ مراتب	۲۰۰ درہم

۹	انصار و مہاجرین کی ازواج	۲۰۰ سے ۴۰۰ درہم
۱۰	اہلِ بدر کی اولادِ ذکور	۲۰۰۰ درہم

اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جن لوگوں کے جو وظیفے مقرر تھے ان کے غلاموں کو بھی اسی قدر وظیفے دیے جاتے تھے۔ (الفاروق: ۲/ ۹۲-۹۷)

مسجدِ نبوی کی توسیع: دورِ خلافت میں رفاہی امور اور تعمیرات کے تعلق سے بہت کچھ ہوا؛ لیکن اس میں خاص طور سے قابلِ ذکر مسجدِ نبوی کی توسیع ہے۔ ۱۷ھ میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کو خیال ہوا کہ آبادی کی کثرت مسجدِ نبوی کی توسیع کی متقاضی ہے، تو آپؓ نے اکابر صحابہؓ کے باہمی مشورہ سے مسجد کے تین اطراف میں اضافہ کیا، حضرت عباسؓ کے پورے مکان کو اور حضرت جعفرؓ کے نصف مکان کو ان کے ورثا سے ایک لاکھ درہم میں خرید کر مسجد میں شامل کیا۔ جانبِ مغرب بیس ہاتھ بڑھا کر دو ستون قائم کیے، جانبِ قبلہ ایک کمان بڑھائی جس کا عرض دس ہاتھ تھا، جانبِ شمال تیس ہاتھ رقبہ وسیع کیا، اس توسیع کے بعد مسجدِ نبوی کا طول ۱۴۰ ہاتھ اور عرض ۱۲۰ ہاتھ ہوگیا، چھ دروازے بنائے گئے: امام کے مصلے کی داہنی جانب دو، اور بائیں جانب دو، اور دو مصلے کے مقابل بنائے گئے۔

(سیرت احمد مجتبیٰ ۲/ ۸۹)

احتساب: یہ بات مسلّم ہے کہ خلیفۂ وقت کی ذمہ داری حکومت کے انتظامات تک محدود نہیں ہوتی؛ بلکہ سب سے اہم فریضہ حکّام کی نگرانی اور رعایا کے اخلاق

واطوار کی پاسبانی ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کے یہاں اس کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔

آپ گاہے گاہے عمّال ورعیت کا احتساب کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ عمّال کی مالی حالت میں غیر معمولی اضافہ ہوا، خالد بن صَعَق نے بذریعۂ اشعار امیر المؤمنین کو باخبر کیا، آپ نے تمام عمّال کی املاک کا جائزہ لیا اور آدھا مال بٹا کر بیت المال میں داخل کروادیا۔ (خلفائے راشدین:۱۳۶)

حضرت عمرؓ اخلاق کے تحفظ کے ضامن

سیدنا عمر فاروقؓ جس طرح اسلامی اخلاق کے پیکرِ مجسم تھے، چاہتے تھے کہ تمام لوگ نبوی اخلاق سے آراستہ اور اسلامی تعلیمات سے مزین ہوجائے، آپ نے عرب جیسی فخّار اور غرور کی شیدائی قوم سے فخر وغرور کے سارے نشانات اس طرح نیست ونابود کیے کہ آقا وغلام، شاہ وگدا میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ ''الادب المفرد'' کی روایت ہے کہ ابو محذورہ کا بیان ہے: میں امیر المؤمنین کی مجلس میں تھا کہ حضرت صفوان بن امیہؓ ایک خوان لے کر آئے اور آپ کے سامنے رکھ دیا، آپ نے غربا، مساکین اور غلاموں کو بلایا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کیا، پھر فرمایا: خدا لعنت کرے ان لوگوں پر جو غلاموں کے ساتھ کھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ (الادب المفرد، مترجم:۱۱۹)

شعر وشاعری میں بدگوئی اور ہجو کرنا عربوں کا عام مذاق اور روزمرہ کی بات تھی، آپؓ نے نہایت سختی سے اس کی روک تھام کی۔ اُس زمانہ میں ایک مشہور

ہجو گو شاعر تھا، آپ نے اس کو پسِ زنداں کر دیا اور اس شرط پر رہا کیا کہ کسی کے متعلق بدگوئی نہیں کرے گا۔ (خلفائے راشدین: ۱۳۸)

آپ مسلمانوں کو اخلاقِ قبیحہ سے پاک صاف کرنے کے ساتھ اوصافِ جمیلہ سے آراستہ کیا کرتے تھے، بلفظِ دیگر تصوف کا کام بھی آپ ہی انجام دیتے تھے، عدل وانصاف آپ کی حکومت کا امتیاز تھا، تمام عمّال کو حکم تھا کہ اہلِ اسلام کے ساتھ زدوکوب کا معاملہ نہ کریں؛ کیوں کہ اس سے ان کی تذلیل ہوگی۔

(طبقات ابن سعد مترجم: ۳/ ۲۰۱)

اسلامی حکومت، عدل وانصاف کی تصویر

عہدِ فاروقی میں جس قدر فتوحات کا دائرہ وسیع وعریض ہوا، اسی قدر مختلف ممالک اور مذاہب، اسلام کے نظامِ سلطنت کے زیرِ دست آئے؛ لیکن اس کے باوجود پوری سلطنتِ اسلامیہ میں مغرب سے مشرق تک شمال سے جنوب تک ہر جگہ چین وسکون کی خوشگوار فضا قائم تھی، ویسے دنیا میں ایسے بادشاہ بھی گذرے ہیں جن کے رعب وداب، جاہ وجلال اور شان وشوکت کے بڑے چرچے تھے؛ لیکن حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شان تو نرالی تھی اور اس کی وجہ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے تحریر کی ہے: دیگر شاہان کو جو شان وشوکت حاصل تھی اس کی بنیاد یہ اصول تھے: ایک شخص کے جرم کی پاداش میں تمام خاندان کو گرفتار کیا جائے، واقعات کے ثبوت میں بجائے یقین کے صرف تخمینہ اور قیاس کو مدار قرار دیا جائے اور بغاوت کے ذرا سے

احتمال پر انصاف کا قانون الٹ دیا جائے، برخلاف خلافتِ فاروقی کے کہ کبھی ذرا برابر بھی انصاف سے تجاوز نہیں ہوتا تھا۔ (الفاروق: ۲/ ۱۷۲)

حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ گورنرِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے ایک مصری کو بے وجہ کوڑے مارے، اس نے حضرت عمرؓ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر شکایت کی، آپؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو خط لکھا کہ اپنے بیٹے کو لے کر حاضر ہوجائے، جب وہ آگئے تو اس مصری سے ان کو کوڑے لگوائے، پھر حضرت عمرو بن عاصؓ سے مخاطب ہوکر کہا: کب سے تم نے لوگوں کو اپنا غلام بنالیا ہے جب کہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے، حضرت عمروؓ نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! مجھے نہ اس واقعہ کا علم تھا نہ یہ میرے پاس آیا۔

(کنز العمال ۱۱۔ ۱۲/ ۶۴۲)

جبلہ ابن ایہم رئیسِ شام نے کعبہ کا طواف کرتے وقت ایک شخص کو طمانچہ مارا، اس نے بھی جواب میں طمانچہ مارا، جبلہ نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپؓ نے جواب دیا کہ جیسا کیا ویسا پایا، جبلہ کو اس جواب سے حیرت ہوئی اور مرتد ہوکر قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ (خلفائے راشدین: ۱۵۴)

شہادت ہے مقصود ومطلوبِ مومن

آپؓ کی تمنا تھی کہ راہِ خدا میں شہادت نصیب ہو، اور دعا کرتے تھے:

"اللهم ارزقني شهادةً من بلد رسولک" اے اللہ! مجھے اپنے رسول کے شہر میں شہادت عطا فرما۔ (بخاری، کتاب الجہاد: ۱/ ۵۹۷) اس دعا کی قبولیت کا وقت آ چکا تھا۔

ایک روز آپؓ بازار سے گذر رہے تھے، مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابولؤلؤ آیا اور کہنے لگا کہ میرا آقا مجھ سے زیادہ رقم وصول کرتا ہے، آپ سفارش کر کے تخفیف کرائیے، آپ نے دریافت کیا کہ کتنی رقم لیتا ہے؟ کہا: یومیہ دو درہم، پھر دریافت کیا کہ کیا پیشہ اختیار کیا ہے؟ کہا: آہن گری، نقاشی اور نجاری، تو فرمایا: یہ رقم زیادہ نہیں، یہ جواب سن کر وہ بددل ہو گیا اور چل دیا، آپ نے اس کے بدلتے تیور سے محسوس کر لیا اور فرمایا: یہ مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔

ایک دن صبح کی نماز کے لیے تشریف لائے، ادھر ابولؤلؤ بھی خنجر بکف ہو کر آیا، جوں ہی آپؓ نے نماز شروع کی، اس نے حملہ کر دیا، اور چھ کاری وار کیے، آپ نے عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو نائب بنایا اور خود صدمۂ زخم سے بے ہوش ہو کر گر گئے، بالآخر اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے اور تین دن بعد جامِ شہادت نوش فرمایا۔

(تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۳۸۲)

زہے قسمت کہ اپنا آشیاں ان کا چمن ہوتا

جب آپؓ کو یقین ہو گیا کہ اب رحلت کا وقت آ گیا ہے تو اپنے نورِ نظر حضرت عبداللہ سے گویا ہوئے: اے پسر! ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے جا کر سلام کہو، اور درخواست کرو کہ عمر اپنے ساتھیوں کے پہلو میں سونا چاہتا ہے، حضرت عبداللہ

گئے تو دیکھا کہ حضرت ام المؤمنین رو رہی ہیں، سلام عرض کیا اور دفن کی اجازت چاہی، آپؓ نے اجازت دے دی۔ حضرت عبداللہ غمی خوشی کے ملے جذبات کے ساتھ والد گرامی کی طرف لوٹے۔ آپ نے پھر کہا: اے عبداللہ! جب میرا انتقال ہوجائے تو جنازہ لے کر حجرۂ عائشہ پر جانا اور پھر اجازت طلب کرنا، اگر اجازت ملے تو دفن کر دینا؛ ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا، آخر اجازت ملی اورآپؓ اپنے رفیقوں کے ساتھ ابدی نیند سو گئے۔ (سیرۃ عمر بن الخطاب:۵۰۹)

آخری لمحاتِ زیست

حضرت عثمان بن عفانؓ راوی ہے کہ میں حضرت عمر فاروقؓ کی آخری ملاقات کے لیے گیا، تو دیکھا کہ آپ کا سر اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کی آغوش میں ہے اور آپؓ کہہ رہے ہیں: اے پسر! میرا سر زمین پر رکھو۔ حضرت عبداللہؓ نے عظمتِ پدری میں اپنی ران پر ہی رہنے دیا، پھر آپؓ نے پُر درد لہجے میں کہا: میری اور میری ماں کی خرابی ہے اگر میری مغفرت نہ ہوئی، بار بار یہی کہتے رہے؛ تا آں کہ روح پرواز کر گئی۔

حضرت سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ: آپ نے آخری لمحات میں کہا: کاش میں کچھ نہ ہوتا، کاش! میں نسیاً منسیا ہوتا۔ پھر ایک لکڑی اپنی چادر میں لی اور کہا: کاش! میں اس کے مثل ہوتا، کوئی جلا کر راکھ کر دیتا۔

(طبقات ابن سعد مترجم: ۳/ ۱۳۳)

یہ اسرارِ علمِ دیں کے ضرور عقدہ کشا رہے ہیں

عرب عام طور پر امّیانہ مذاق رکھتے تھے، ان کا معاشرہ لکھنے پڑھنے کے رواج سے عاری تھا، یہی وجہ ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت قبیلۂ قریش میں صرف سترہ آدمی اس جوہر سے مزین تھے، آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیتِ باکمال کا شمار اسی ممتاز گروہ میں ہوتا ہے۔ (تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۳۹۸)

آپ کی قوتِ تحریر، برجستگیٔ کلام اور زورِ کتابت وخطابت ان فرامین میں جھلکتی ہے جو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کیے ہیں، اولین خطبۂ خلافت کا ایک اقتباس ذیل میں مذکور ہے:

اللهم إني غليظٌ فَلَيِّنِيْ، اللهم إني ضعيف فَقَوِّنِيْ، ألا وإن العربَ جَمَلٌ أنف، وقد أُعْطِيْتُ خِطامَهٗ، ألا وإني حاملُه على الحجة. ترجمہ: اے اللہ! میں تندمزاج ہوں، میرے مزاج میں نرمی پیدا فرما، اے اللہ! میں کمزور ہوں مجھے طاقت عطا فرما۔ اہلِ عرب سرکش اونٹ کی طرح ہے، میرے ہاتھ میں اس کی لگام تھمائی ہے؛ لیکن یاد رکھو! میں ان کو راستہ پر چلا کر چھوڑوں گا۔ (خلفائے راشدین: ۱۵۶)

اگر قوتِ تحریر کا اندازہ کرنا ہے تو پڑھیے وہ فرمان جو بنام حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ لکھا تھا:

"أما بعد! فإن للناس نفرة عن سلطانهم، فأعوذ بالله أن تدركني وإياك عمياءُ مجهولةٌ وضغائنُ حمولةٌ وأهواءٌ متبعةٌ، كُنْ مِنْ مالِ اللّٰه على

حَذَرٍ وَخِفُ الفُسَّاقَ، واجعلهم يدا يدا ورجلا رجلا، وإذا كانت بين القوم ثائرةٌ يا لفلان! يا لفلان، فإنما تلك نجوى الشيطان، فاضربوهم بالسيف حتى يفيئوا إلىٰ أمر اللّٰه ويكون دعوتُهم إلى الاسلام. (الفاروق:۲/۲۶۵)

قدرت نے آپ کو شعر وشاعری کا بھی عمدہ ذوق عطا کیا تھا، آپ کو شعرائے عرب کے کلام پر تنقیدی نظر حاصل تھی، مشاہیر میں سے زہیر کا کلام آپ کو نہایت پسند تھا، اس کو ''اشعر الشعراء'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ ذوقِ شاعری اپنی ذات تک محدود نہ تھا؛ بلکہ عمّال اور حکّام کو بذریعۂ تحریر تاکید کیا کرتے تھے کہ اشعار اور عربی ادب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ چناں چہ آپ رضی اللہ عنہ نے تمام اضلاع میں جو حکم بھیجا تھا اس کے الفاظ یہ تھے: عِلّموا أولادَكم العُوْمَ والفُرُوْسِيَةَ ورَوُّوْهُمْ ما سار من المثل وحسن من الشعر، اپنی اولاد کو تیرا کی اور شہسواری سکھاؤ اور ضرب المثل اور اچھے اشعار یاد کراؤ۔ (الفاروق:۲/۲۷۱)

علومِ اسلامیہ کے بنیادی اصول واساسی سرچشمہ؛ قرآن، حدیث اور فقہ میں بھی آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا، اور بہت سے ایسے مسائل جو صدرِ اول میں اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کے مابین مختلف فیہ تھے انھیں آپ کے دورِ خلافت میں اجماعی صورت دی گئی۔

موافقاتِ عمر، قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

قسّامِ ازل نے آپ کو فطری طور پر ذہانت وفطانت اور اصابتِ رائے کا

وافر حصہ عطا کیا تھا، لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے "إن اللّٰه جعل الحق علیٰ لسان عمر و قلبه" (ترمذی، مناقب عمر بن الخطاب: ۲/ ۲۰۹) کا مژدہ سنا کر اس خوبی کو دوبالا کر دیا۔ آپ کے فرزند عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب بھی کوئی مسئلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان موضوعِ بحث بنا، لوگوں کی رائے کچھ ہوئی اور آپ کی کچھ ہوئی تو قرآن اُس رائے کی تصدیق میں نازل ہوا جو آپ نے پیش کی تھی۔ (أیضاً) آپ کی اس خصوصیت کو اہلِ سیر "موافقاتِ عمر" کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کے چند اشارے ذیل میں مذکور ہے:

۱ - وما كان لنبي أن يكون له أسرىٰ حتى يثخن في الأرض. (الأنفال)

۲ - واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى (البقرة: ۱۲۵)

۳ - يسئلونك عن الخمر (البقرة: ۲۱۹)

۴ - فتبارك اللّٰه أحسن الخالقين (المؤمنون: ۱۴)

۵ - ولا تُصَلِّ علىٰ أحد منهم مات أبدا (التوبة: ۸۴

۶ - يأيها الذين اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة إلخ (النساء: ۴۳)

۷ - سواء عليهم استغفرت لهم إلخ (المنٰفقون: ۶)

۸ - كما أخرجك ربك من بيتك بالحق} (الأنفال: ۵)

۹ - سبحانك هذا بهتان عظيم (النور: ۱۶)

۱۰ - أحل لكم ليلة الصيام (البقرة: ۱۸۷)

۱۱-من كان عدوا الله وملئكته ورسله إلخ (البقرة: ۹۷)

۱۲-فلا وربک لايؤمنون حتى يحكموک فيما شجر بينهم (النساء: ۶۵)

۱۳-يا أيها الذين امنوا ليستأذنكم الذين ملكت أيمانكم والذين لم يبلغوا الحلم منكم ثلاث مرات (النور: ۵۸)

۱۴-ثلة من الأولين وثلة من الاخرين (الواقعة: ۳۹)

۱۵-الشيخ والشيخة إذا زنيا **کی تلاوت کا منسوخ ہونا۔**

۱۶-عسىٰ ربه إن طلقكن أن يبدله أزواجا خيرا منكن (التحريم: ۵۱)

(تاریخ الخلفاء: ۹۶-۹۸)

فضائل ومناقب

آپ رضی اللہ عنہ کی عبقری شخصیت فطری محاسن ومحامد سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بار بار بشارتوں سے نوازی جا چکی تھی، جس سے آپ کی شخصیت اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہر امت میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زبان پر حق جاری ہوتا ہے، اگر میری امت میں کوئی ہے تو وہ عمر بن خطاب ہے''۔

(بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ ۱/۸۰۶، ح: ۳۵۵۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ: ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب کا تذکرہ کیا کہ میں نے جنت دیکھی، وہاں ایک عورت محل کے پاس وضو کر رہی تھی، میں نے ملائکہ سے دریافت کیا کہ یہ محل کس کا ہے؟ تو جواب دیا: عمر بن خطاب کا ہے، میں اس میں داخل ہونا چاہا؛ لیکن عمر کی غیرت کی وجہ سے داخل نہ ہوا۔ (بخاری: ۱/ ۸۰۴، حدیث: ۳۵۴۸)

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ راوی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آج اللہ تعالیٰ عرفہ میں موجود لوگوں پر فخر کرتے ہیں اور خاص طور پر عمر بن خطاب پر فخر کرتے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء: ۹۳)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد نبی اگر کوئی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔ (ترمذی: ۲/ ۲۰۹)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ سے واپس تشریف لائے، تو ایک سیاہ فام عورت حاضرِ خدمت ہوئیں اور کہا کہ: اے اللہ کے رسول! میں نے نذر مانی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غزوہ سے صحیح سالم واپس لائیں گے تو آپ کے سامنے دُف بجاؤں گی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دُف بجا! اس نے دُف بجانا شروع کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے وہ دُف بجاتی رہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تب بھی دُف بجاتی رہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے تب بھی وہ بدستور بجاتی رہیں؛ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اپنے

آلات چھوڑ کر بیٹھ گئی، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے عمر! اللہ نے آپ کو ایسا رعب دیا ہے کہ شیطان بھی آپ سے ڈرتا ہے۔ (ترمذی: ۲/ ۲۱۰)

سیرت وصورت

آپ رضی اللہ عنہ ہر نوع کے فضائل ومحامد سے مزین تھے، ظاہری وباطنی کمالات سے آراستہ تھے، اسلامی اخلاق واطوار کے پیکرِ مجسم تھے؛ بلکہ یوں کہیے کہ آپ رضی اللہ عنہ چلتا پھرتا اسلام تھے۔

حلیۂ مبارک: رنگت سفید؛ لیکن سرخی مائل، قد اس قدر لمبا تھا کہ پیادہ پا لوگوں میں سوار محسوس ہوتے تھے، رخسار پچکے ہوئے کم گوشت تھے، داڑھی گھنی اور مونچھیں بڑی، سر کا اگلا حصہ بالوں سے عاری تھا۔ بلال بن عبداللہ کہتے ہیں کہ: آپ تیز رفتار اور گندمی رنگ کے تھے، جیسے بنی سدوس کے لوگ ہوتے ہیں، دونوں پاؤں کے درمیان کشادگی تھی۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۰۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: آپ مہندی کا خضاب کرتے تھے۔ (تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام، عہد الخلفاء الراشدین: ۲۵۵)

وضع قطع: لباس معمولی اور سادہ ہوتا تھا، اکثر قمیص زیب تن کرتے تھے، بعض وقت بُرنس (ایک قسم کی ٹوپی) بھی پہنتے تھے، جوتیاں عربی وضع کی ہوتی تھیں جن میں تسمہ ہوتا تھا۔ (الفاروق: ۲/ ۲۹۸)

آدھی دنیا کے حکمراں ہونے کے باوجود سادگی اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ

انس بن مالکؓ کا بیان ہے: میں نے امیر المؤمنین کو دیکھا کہ آپ کے کرتے میں تین پیوند تھے، ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ ابوعثمان نہدی کہتے ہیں: میں نے امیر المؤمنین کو دیکھا کہ آپ بیت اللہ کا طواف کررہے ہیں اور جسم پر تہبند ہے جس میں بارہ پیوند تھے اور ایک سرخ چمڑے کا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۰۴)

کپڑوں کی قلت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز میں تاخیر ہوگئی، منبر پر چڑھ کر لوگوں سے معذرت کی کہ میرے پاس ایک ہی کرتا ہے، سُکھانے میں دیر ہوگئی۔ سادگی کا اس قدر غلبہ تھا کہ بہت سی مرتبہ باہر سے آنے والے وفود اور قاصدوں کو یقین کرنا مشکل ہوتا تھا کہ یہی مسلمانوں کے امیر حضرت عمرؓ ہیں۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۱۰۵)

<u>غذا:</u> آپ کی غذا وخوراک بھی نہایت سادہ تھی، اکثر آپ کے دسترخوان پر روٹی اور روغنِ زیتون ہوا کرتا تھا، روٹی بے چھنے آٹے کی ہوتی تھی۔ عتبہ بن فرقد نے ایک مرتبہ عرض کی، اے امیر المؤمنین! کھانے میں کچھ تبدیلی کرلیں، تو آپؓ نے جواب دیا کہ کیا دنیا کی لذتوں سے مزہ لے کر عیش وعشرت میں کھو جاؤں۔ (تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام، عہد الخلفاء الراشدین: ۲۶۸)

حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے: میں نے امیر المؤمنین کو دیکھا کہ آپ کے لیے ایک صاع کھجوریں ڈال دی جاتی تھیں۔ آپ اس میں سے ردی بھی کھالیا کرتے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۹۸)

اخلاق وعادات

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مکارمِ اخلاق کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی، خود لسانِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا: "إنما بعثت لأتمم مکارم الأخلاق" میری بعثت مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معجزانہ تعلیم وتربیت سے شمعِ نبوت کا ہر ہر پروانہ مکارمِ اخلاق کا مجسم نمونہ تھا، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی شان اس باب میں بھی نرالی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ خوفِ خدا، حبِّ رسول، اتباعِ سنت، زہد وقناعت اور تواضع کی مجسم تصویر تھے۔

خوفِ خدا اور رجائے الٰہی: یہ بات مسلم ہے کہ اخلاق کی پختگی اور استواری کا اصل سرچشمہ خشیتِ الٰہی ہے۔ یہ تمام فضائل ومحامد کی جڑ ہے، قلب جس قدر خوفِ الٰہی سے لرزاں ہوگا اسی قدر وہ بلند مقام پر ہوگا، اور جو قلب اس نعمت سے بہرہ ور نہ ہو وہ محض مضغۂ گوشت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ خشیتِ الٰہی سے ہر لحظہ لرزاں وترساں رہتے تھے، نمازوں میں اکثر وہ سورتیں پڑھتے جن میں قیامت کے ہولناک مناظر اور اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی کی عظمت وجلال کا بیان ہو اور زار وقطار روتے جاتے۔ عبد اللہ بن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں: آپ رضی اللہ عنہ نماز میں انما أشکو بثي وحزني إلى الله پڑھ رہے تھے اور اس زور سے رو رہے تھے کہ میں باوجود آخری صف میں ہونے کے رونے کی آواز سنتا تھا، بسا اوقات روتے روتے دم گھٹنے لگتا تھا۔ (بخاری: کتاب الاذان، باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ: ۱/ ۱۴۷)

آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آسمان سے کوئی آواز لگائے کہ اے لوگو! تم سب جنت میں داخل ہوں گے سوائے ایک شخص کے، تو مجھے خوف ہوگا کہ کہیں وہ میں نہ ہوں، اور اگر یہ آواز آئے کہ تم سب جہنم میں جاؤں گے سوائے ایک کے، تو مجھے امید ہے کہ وہ میں ہوں۔ (کنز العمال: ۱۱-۱۲/۶۲۷)

گویا آپ رضی اللہ عنہ کا ایمان خوف ورجا کے مابین ہوتا تھا۔ بعض دفعہ خوفِ الٰہی سے اس قدر لرزتے کہ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ رضی اللہ عنہ خوفِ الٰہی کی وجہ سے کہا کرتے تھے: کاش! میں گھر والوں کا دنبہ ہوتا، وہ مجھے اپنی مرضی سے موٹا کرتے، جب میں خوب موٹا ہو جاتا، پھر ان کے ہاں کوئی محبوب مہمان آتا، وہ میرے بعض حصہ کو بھونتے اور بعض کو قدید بناتے، پھر مجھے کھا جاتے اور فضلہ بنا کر نکال باہر کرتے، کاش! میں انسان نہ ہوتا۔ (کنز العمال: ۱۱-۱۲/۶۲۶)

حبِّ رسول اور اتباعِ سنت کا جذبہ

ہر مسلمان کا دل عشق سوزی اور اتباعِ سنت کے جذبے سے موجزن ہونا ضروری ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ اس وصف میں بھی ممتاز تھے، اس کے لیے اپنی جان ومال، آل واولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ: آپ میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے، تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جب تک میں تمہاری جان سے بھی

زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں تب تک محبت میں سچائی اور ایمان میں کاملیت نہیں ہوسکتی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اب آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہے، تو ارشاد فرمایا: اے عمر! اب ایمان تام ہوا۔ (مرقاۃ: ۱/ ۱۳۹)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جب بھی آپ کا تذکرہ سنتے تو رقت طاری ہوجاتی اور بے تاب ہوکر رو پڑتے تھے۔

اتباعِ سنت کا کیسا جذبہ موجزن تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے کہ خود آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب سے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے چھنے آٹے کی روٹی کھاتے دیکھا ہے تب سے میں بھی بے چھنے آٹے ہی کی روٹی کھاتا ہوں۔ (کنز العمال: ۱۱۔ ۱۲/ ۶۰۳)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقامِ ذوالحلیفہ سے حج کا احرام باندھا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا تو ان کا معمول ہوگیا، جب بھی حج کے لیے تشریف لے جاتے تو مقامِ ذوالحلیفہ سے احرام باندھتے۔

(مسلم: ۱/ ۳۷۶)

زہد وقناعت: تمام معاصی، گناہ ونافرمانی اور بے راہ روی کی اصل جڑ حبِّ دنیا ہے، اسی چیز نے پہلی قوموں کو ہلاک کیا، اس لیے مشہور حدیث ہے: ”حب الدنیا رأس کل خطیئة“ (مشکوٰۃ: کتاب الرقاق: ۴۴۴، الجامع الصغیر للسیوطی: ۱/ ۲۲۳) دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے، دنیا سے بے رغبتی تمام طاعات کا منبع

ہے، اس لیے ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ اس جوہرِ بیش قیمت سے اپنے آپ کو مزین کر کے زہد وقناعت کی زندگی گزارے۔

یہی آپ رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی خوبی اور وصف تھا، زہد و دنیا طلبی سے بے اعتنائی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ ۔ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ: قدامتِ اسلام اور ہجرت کے اعتبار سے لوگ آپ رضی اللہ عنہ سے سبقت لے گئے ؛ لیکن زہد وقناعت میں آپ رضی اللہ عنہ سب کے امام وپیشوا تھے۔

(خلفائے راشدین:۱٦٦)

ایک مرتبہ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو صدقات کے وصول کرنے پر مامور کیا، جب آپ رضی اللہ عنہ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہوئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجرت دینا چاہا، آپ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ کام میں نے خالص اللہ کی رضا مندی کی خاطر کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس کو قبول کر لو پھر جہاں دل چاہے خرچ کرو۔ (ابوداود، کتاب الزکوۃ، باب فی الاستعفاف: ۲۳۴)

یہ واقعہ آپ کی دنیا سے بے اعتنائی و بے رغبتی کی روشن مثال ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ جس طرح زاہد وقانع تھے ہر شخص کو اس حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ احنف بن قیس ایک جماعت کے ساتھ عراق کی ایک مہم پر روانہ کیے گئے، وہ وہاں سے کامیاب ہوکر تزک واحتشام کے ساتھ واپس آئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی زرق برق پوشاک دیکھ کر منہ پھیر لیا، وہ لوگ حضرت امیر

المؤمنین کو برہم دیکھ کر دربار سے اُٹھ آئے اور عرب کی سادہ پوشاک زیب تن کر کے حاضرِ خدمت ہوئے، حضرت عمرؓ اس لباس میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرداً فرداً ہر ایک سے بغل گیر ہوئے۔ (خلفائے راشدین:۱۶۹)

بے مثال خاکساری وانکساری

انسانی اخلاق واوصاف کا بہترین وصف تواضع وانکساری ہے، اسی سے آدمی بلندیوں کو طے کرتا ہے، ایک طرف آپؓ کا رعب ودبدبہ ایسا کہ قیصر وکسریٰ کا پایۂ تخت جس سے متزلزل، تو دوسری طرف تواضع وانکساری ایسی کہ گویا آپ تواضع کی مجسم تصویر۔

حضرت حسن بصریؒ کا بیان ہے: آپؓ گرمی کے دنوں میں گھر سے نکلے، چادر سر پر رکھی ہوئی تھی، ایک لڑکا آپ کے پاس سے گدھے پر سوار گذرا، اس سے کہا: مجھے اپنے ساتھ سوار کر لیجیے، لڑکا آپؓ کی عظمت میں گدھے سے اتر کر کہنے لگا، اے امیر المؤمنین! آپ سوار ہوجائیں، آپؓ نے کہا: نہیں، میں تنہا سوار نہ ہوں گا، بالآخر آپؓ اس لڑکے کے پیچھے سوار ہو کر مدینۂ منورہ میں داخل ہوئے اور لوگ اس منظر کو بنظرِ استعجاب دیکھتے رہے۔ (کنز العمال:۱۲/ ٦۴۰)

تقویٰ وطہارت

تقویٰ وطہارت میں بھی آپؓ کو امتیازی مقام حاصل تھا، حضرت زید بن اسلمؒ کا بیان ہے: ایک مرتبہ آپؓ نے دودھ نوش کیا، بہت پسند آیا تو لانے

والے سے پوچھا، یہ دودھ کہاں سے لائے ہو؟ بتلایا میں ایک چشمہ پر گیا تھا، جہاں صدقات کے اونٹ چرتے تھے، میں نے دیکھا کہ لوگ دودھ پی رہے ہیں، انہوں نے مجھے بھی دودھ دیا، وہ آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں، یہ سننا تھا کہ گھبرائے اور حلق میں انگلی ڈال کر سارا دودھ قے کر دیا۔ (کنزالعمال: ۱۲/ ۲۴۱)

حضرت براء بن معرورؓ کے صاحب زادے بیان کرتے ہیں کہ: آپؓ کو کوئی تکلیف پیش آئی، طبیب نے علاج میں شہد کا نسخہ تجویز کیا، ان دنوں بیت المال میں شہد کا مٹکا بھرا ہوا تھا؛ لیکن آپؓ نے لوگوں سے فرمایا: اگر تم لوگ شہد استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہو تو میں استعمال کروں؛ ورنہ میرے لیے حرام ہے، سب نے اجازت دی اور آپؓ نے شہد استعمال کیا۔ (کنزالعمال: ۱۲/ ۲۴۰)

رفاہِ عام اور خدمتِ خلق

نصف دنیا کا عظیم حکمران ہونے کے باوجود آپؓ کا یہ حال تھا کہ ضعفا وغربا اور محتاجوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کا بیان ہے: ایک رات آپؓ تاریکی میں نکلے، ایک گھر میں داخل ہوئے، پھر دوسرے میں، میں نے صبح اس گھر میں جا کر دیکھا تو ایک بڑھیا تھی، پوچھا: یہ شخص تمہارے پاس کیوں آتا ہے؟ تو کہا: یہ ایک طویل عرصے سے میری خدمت کرتا ہے اور ضروری سامان مہیا کرتا ہے۔ (سیرۃ عمر بن الخطاب: ۱۳۵)

ایک رات آپ گشت کر رہے تھے، ایک خیمہ سے کسی کے کراہنے کی آواز

سنی، باہر ایک بدّو بیٹھا تھا، حال دریافت کیا تو کہا مسافر ہوں، میری عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے، کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں، آپ رضی اللہ عنہ فوراً گھر آئے اور اپنی زوجہ حضرت امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر بدّو کے پاس گئے، حضرت امِ کلثوم رضی اللہ عنہا خیمے میں تشریف لے گئی اور آپ بدّو کے ساتھ باہر بیٹھ گئے، بچہ کی ولادت ہوگئی تو حضرت امِ کلثوم رضی اللہ عنہا نے کہا: اے امیر المؤمنین! اپنے دوست کو مبارک باد دیجیے۔ بدّو ''امیر المؤمنین'' کا لفظ سن کا گھبرایا اور چونک پڑا، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا: کچھ خیال نہ کرو، کل میرے پاس آجانا، تمہارے بچہ کا وظیفہ مقرر کردوں گا۔ (خلفائے راشدین:۱۷۸)

آپ رضی اللہ عنہ کے غلام اسلم کا بیان ہے کہ ایک رات آپ رضی اللہ عنہ نے گشت کرتے ہوئے ایک عورت کو دیکھا، اس کے ارد گرد بچے رو رہے ہیں، چولہے پر برتن رکھا ہوا ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے قریب جا کر دریافت کیا: اے اللہ کی بندی! یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ تو بتایا: بھوک کی وجہ سے، اور کہا کہ: برتن میں پانی رکھ کر ان بچوں کو بہلا رہی ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ یہ ماجرا دیکھ کر رو پڑے اور بیت المال پر تشریف لائے، ایک بوری میں کچھ آٹا، گھی، کھجور، کپڑے اور دراہم ڈالے اور اپنے غلام اسلم سے کہا کہ: میرے کندھے پر رکھ دو، انہوں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! میں اٹھاؤں گا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کل قیامت کے روز بھی میرا بوجھ تم اٹھاؤ گے! پھر بوری اٹھا کر عورت کے پاس پہنچے، خود چیزیں نکال کر برتن چولہے پر رکھ کر آگ پر پھونک مارنے لگے؛ یہاں تک کہ دھواں آپ رضی اللہ عنہ کی داڑھی کے درمیان سے نکل رہا

تھا، پھر کھانا تیار ہوا تو اپنے ہاتھ سے نکال کر بچوں کو کھلایا اور ایک طرف بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگے اور فرمایا: ان کو روتے ہوئے دیکھا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو ہنستا ہوا دیکھ لوں۔ (کنز العمال: ۱۱-۱۲/ ۸ ۶۳)

ازواج واولاد

عربوں میں عام دستور تھا کہ ہر شخص متعدد نکاح کرتا تھا، آپؓ نے بھی متعدد نکاح کیے، دورِ جاہلیت میں بھی اور دورِ اسلام میں بھی۔

۱- آپ نے سب سے پہلے زینب بنت مظعون سے رشتۂ ازدواج قائم کیا، جن سے عبداللہ، حفصہ اور عبدالرحمٰن اکبر پیدا ہوئے۔ آپ کی یہ زوجۂ محترمہ اسلام کی دولت گراں مایہ سے بہرہ ور ہوئی، اور اسلام ہی کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

۲- آپ کا دوسرا نکاح مُلیکہ بنت جرول خُزاعیہ سے ہوا، جن سے عبیداللہ متولد ہوئے، چوں کہ یہ بیوی اسلام کی دولت سے محروم تھی، اس لیے ۶ھ صلح حدیبیہ کے بعد طلاق دے کر الگ کردیا۔

۳- پھر آپؓ کا نکاح ام حکیم بنت الحارث بن ہشام سے طے پایا، جن سے فاطمہ پیدا ہوئی۔

۴- پھر مدینۂ منورہ ہجرت کرنے کے بعد جمیلہ بنت ثابت بن ابی الاقلح سے نکاح کیا جن سے عاصم کی پیدائش ہوئی۔

۵۔ پھر آپؓ کی تمنا تھی کہ خاندانِ نبوت سے بھی شرفِ تزوج حاصل کیا جائے تو ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے پیامِ نکاح دیا اور چالیس ہزار پر نکاح کر دیا۔ جن سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے۔

۶۔ پھر آپ نے لہیّہ نامی یمنی عورت سے نکاح کیا جن سے عبد الرحمٰن اصغر پیدا ہوئے۔

۷۔ پھر آپ نے عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل سے رشتۂ ازدواج قائم کیا۔

(تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام، عہد الخلفاء الراشدین: ۲۷۵)

یہ تھے چراغِ ہدیٰ، شمسِ ضحیٰ، ہدایت کے مینار، استقامت وعزیمت کے پہاڑ اور شمعِ نبوت کے پروانے، جو امت کے لیے صرف نمونۂ عمل ہی نہیں؛ بلکہ امت ان کی اقتدا و اتباع کی مامور ہے، جنہیں بارگاہِ ایزدی سے رضامندی کا پروانہ ملا، اور لسانِ نبوت ﷺ نے ”عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين“ کا مژدہ سنا کر مہرِ صداقت و وثوق ثبت کر دی، انہیں کی اتباع میں قوم کی فلاح و بہبودی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ آج کے انحطاط پذیر زمانہ میں مغرب پرستی کے گندے ماحول میں ان کی حیاتِ طیبہ کی درخشندہ گوشوں کو اجاگر کیا جائے اور ان کے اخلاق وسیَر سے امت کو آشنا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔ (آمین)

یہ فیض ہے مقدمِ عمر کا کہ در کھلا ہے خدا کے گھر کا
نماز کعبے میں ہو رہی ہے، فرشتے خوشیاں منا رہے ہیں
مِلا ہے ان کو وہ قلبِ روشن، نثار خود جس پہ فرقِ ایمن
جنابِ شیخین زندگی بھر، رفیقِ شمس الضحیٰ رہے ہیں
مزارِ اقدس کے دائیں بائیں، حضور کی لیتے ہیں بلائیں
نہ اُس جہاں میں جدا رہیں گے، نہ اِس جہاں میں جُدا رہے ہیں
خدا کے بندے خدا نہیں تھے، کسی کے مشکل کُشا نہیں تھے
مگر یہ اسرارِ علمِ دیں کے ضرور مشکل کشا رہے ہیں

مراجع ومصادر:

① بخاری شریف ② مسلم شریف ③ ترمذی شریف ④ ابوداود شریف ⑤ کشف الباری شرح بخاری ⑥ شمائل ترمذی ⑦ فتح الباری ⑧ کنز العمال ⑨ تاریخ الخلفا ⑩ تاریخ الاسلام ووفیات المشاہیر والاعلام ⑪ تاریخ ابن خلدون ⑫ طبقات بن سعد مترجم ⑬ سیرۃ عمر بن الخطاب عربی ⑭ الفاروق ⑮ خلفائے راشدین ⑯ سیرت احمد مجتبیٰ۔